⊙ ڈاکٹر شاہد رضوان
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ گریجویٹ کالج، چیچہ وطنی

بچے: تاریخ، تہذیب، مذہب اور اساطیر کے آئینے میں

Abstract:

Innocent children are like flowers whose fragrance permeates the courtyard of a house. Every woman in the world wants to be a parent. Childless couples pray for children and put offerings on the sacred places. On the other side, those who have frequent births use prescription drugs but if they do get pregnant they get it aborted. Unmarried women also abort. If we study the history of different civilization, the mistreatment with children is revealed. The gods and goddesses loved the sacrifice of children. For the maturity and durability of buildings, they were put in the foundations of the walls. The gods were eager to swallow their own children. It was also thought to be the source of rain. Children were being pounded on the rocks and when they screamed it was thought that the rain was coming down. Similarly in the beginning of agricultural society, pregnant women used to sow the seeds and it was considered that in this way the production of the crop would become better. In Sparta, the seven year child was handed over to the state. The physically weak child was left on the mountains to die. Fearing the growing population of the Israelites in Egypt, Pharaoh ordered to kill the children. The mother of Muses (PBUH) put him in a box and consigned it to the river so that he might escape the wrath of Pharaoh. Plato emphasizes the importance of the joint family in the state of his will so that children could recognize their parents. In Arabia, there was a custom of burying girls alive which was abolished by the Holy Prophet Muhammad

(PBUH). Sacrifice of children is considered acceptable not only to gods but also to the God almighty. The sacrifices of Hazrat Ismail A.S and Hazrat Abdullah Bin Abdul Mutlib are considered to be of the same category. It is said that the first accepted sacrifice was of Habeel. There are so many traditions, myths, sayings and hypothesis like mentioned above about the children which have been analyzed and studied in this article.

Keywords:

Innocent, Children, History, Religion, Legends, Civilization, Goddess, God, Pregnant, Aristotle, Jesus Christ, Moses, Alexander, Hippocrates, Rain, Government, Plato

معصوم بچے ہستی گلشن کے ایسے پھول ہیں جن کی خوشبو سے ارض کائنات مہکتی ہے۔ان کا شور وغوغا ،کھیل کود،شرارتیں اور معصومانہ حرکتوں کے اندر ارتقائے زندگی کا راز پوشیدہ وعیاں ہے۔ان کی کلکاریاں ہی صحیح معنوں میں زندگی کو خوبصورت بناتی ہیں۔جن گھروں میں یہ معصوم فطرت پھول نہیں کھلتے یا کھل کر مرجھا جاتے ہیں،ان گھروں پر کھنڈروں کا گمان ہوتا ہے۔پیغمبر، ولی غرض ہر انسانی جوڑا اپنے گھر کے آنگن کو بچوں سے شاد باد دیکھنے کی خواہش کرتا ہے۔ شاید ہی کوئی بدنصیب جوڑا ایسا ہو جس نے کبھی بچوں کی خواہش نہ کی ہو۔یہ حقیقت ہے کہ ہر جوڑا اولادِ نرینہ ہی طلب کرتا ہے،البتہ بانجھ جوڑوں کے ہاں بیٹی کی تمنا بھی بڑی شدومد کے ساتھ پائی جاتی ہے۔بچوں کی خواہش کے لیے نذریں دی جاتی ہیں،منتیں مانی جاتی ہیں اور چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں، کیونکہ افزائش نسل کی تکمیل ان کے بغیر ممکن نہیں۔ بچے چونکہ معصوم فطرت پر پیدا ہوتے ہیں،اس لیے تاریخ انسانی کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ مختلف تہذیبوں میں نومولود بچوں کی معصومیت سے فائدہ اٹھایا جاتا رہا ہے۔ پیدا ہوتے ہی مرنے والے معصوم بچوں کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ وہ آخرت میں ماں باپ کے لیے جنت کی سفارش کریں گے۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> ''جن دو مسلمانوں کے تین بچے مرجائیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور رحمت سے ان دونوں یعنی ماں اور باپ کو جنت میں داخل کرے گا۔صحابہ کرام نے کہا جن کے دو بچے فوت ہوگئے ان کے لیے بھی بشارت ہے۔آپؐ نے فرمایا ہاں! صحابہؓ نے کہا یہ بھی فرما دیجیے کہ اگر کسی کا ایک بچہ بھی مرجائے تو اس کے والدین کے لیے بھی یہ بشارت ہے۔آپؐ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر کسی عورت کا کچا حمل بھی گر جائے تو وہ اپنی آنول نال کے ذریعے جنت کی طرف کھینچے گا۔بشرطیکہ اس کی ماں صبر کرے اور اس کے مرنے کو اپنے حق میں ثواب شمار کرے''۔(۱)

یہ ان معصوم نومولود بچوں کے حوالے سے کہا گیا ہے جو اپنی طبعی موت مریں۔والدین کے لیے مرنے والے

بچوں کا نعم البدل جنت کو ٹھہرایا گیا ہے تا کہ وہ اس غم کی گھڑی میں صابر و شاکر اور ثابت قدم رہیں۔ ماضی میں ظالم سماج اپنے گھناؤنے اور مذموم مقاصد کی تکمیل کی خاطر معصوم بچوں کی فطرت کو کچلتا رہا ہے۔ تاریخ انسانی کے اوراق معصوم بچوں کی عبرت ناک داستانیں اپنے اندر محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ جب ہم تاریخ انسانی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں جگہ جگہ ان بچوں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں جو دیوتاؤں کی خوشنودی، کھیتی باڑی کی افزائش، بارش کے حصول اور عمارتوں کی بنیادوں میں دفن ہوتے رہے ہیں اور ظالم آقاؤں کی خوشنودی اور زندگی کی بقا کی خاطر بھینٹ چڑھتے رہے ہیں۔ انسان کی قربانی کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود انسان کی۔ اقلیما سے شادی کے معاملے میں ہابیل کی قربانی مقبول ہوئی۔ پھر اس کے بعد تو یہ سلسلہ چل نکلا اور قدم قدم پر انسان اس قربانی کا محتاج و دست نگر بنتا چلا گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان معصوم بچوں کے ساتھ کس کس طرح بہیمانہ سلوک کیا جاتا رہا ہے۔ ابتدا میں جب انسان نے مہذب زندگی گزارنے کا ابھی ڈھب نہیں سیکھا تھا۔ جرگے کے عہد میں مادری نظام رائج تھا جو کئی ہزار سال تک رہا، اس دور میں پیدا ہونے والے بچوں کی شناخت کا یہ عالم تھا:

> ''اس قسم کے سماجی ڈھانچے کی تہہ میں جو اصول اصل میں کارفرما تھا وہ نسوانی قرابت داری تھی۔ اس کی وضاحت اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ اجتماعی شادیوں کا عام رواج تھا۔ چنانچہ بچوں کو اس بات کا کبھی علم ہی نہیں ہوتا تھا کہ ان کا باپ کون ہے؟۔ وہ صرف اپنی ماں کو جانتے تھے۔ اس کی رشتے داری خالصتاً ماں کی طرف منسوب ہوتی تھی''۔ **(۲)**

ہندوستان میں آریائی تسلط نے مقامی آبادی کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ۱۔ پروہت (برہمن) سب سے اونچی ذات۔ ۲۔ کھتری، لڑائیوں میں حصہ لینے والے۔ ۳۔ ویش کسان، تاجر اور دستکار۔ ۴۔ شودر، اجرت پر کام کرنے والے یعنی غلام۔ ان کے درمیان ایسی سماجی فصیلیں کھڑی کی گئی تھیں جن کو عبور کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوتا۔ ذات پات اور اونچ نیچ کا اتنا ظالم تصور تھا کہ اونچی ذات (برہمن) کا بچہ نچلی ذات (کھتری وغیرہ) کے بزرگ شخص سے مرتبے میں بلند ہوتا:

> ''ذاتوں کے درمیان شادیاں کرنا ممنوع تھیں، یا کم از کم انہیں قانونی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ ذاتوں کے مابین شادیوں سے جو اولاد ہوتی تھی اسے ناپاک تصور کیا جاتا اور نیچ ذات میں شمار کر لیا جاتا تھا۔ پروہتوں یعنی برہمنوں کی ذات کو سب سے زیادہ رعایتیں حاصل تھیں۔ انہیں ہر وضع کے محصولوں، فوج میں بھرتی اور جسمانی سزا سے چھوٹ دے دی گئی تھی قدیم ہندوستان کے قوانین کے مطابق برہمن ذات کے نو سالہ بچے کو کھتریوں میں سے کسی نوے سالہ آدمی کی بہ نسبت باپ کے برابر سمجھا جاتا تھا''۔ **(۳)**

اساطیری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ظالم دیوتا بھی گزرے ہیں، جو اپنے ہی بچوں سے شدت کے ساتھ نفرت کرتے تھے۔ ان کو نگل جاتے تھے یا پھر تاریک غاروں میں دھکیل کر خوشی محسوس کرتے تھے۔ یورے نس آسمان کا دیوتا اور دھرتی کی دیوی جیا یونانیوں کے نزدیک نسلِ انسانی کے جدِ امجد ہیں۔ ان کے ہاں بارہ بچے پیدا ہوئے، چھ لڑکیاں اور چھ لڑکے، لیکن یورے نس کو اپنے بچوں سے شدید نفرت تھی۔ وہ اپنے ہاں پیدا ہونے والے نومولود کے لیے خود ہی ایسی عبرت ناک سزا

تجویز کرتا تھا کہ جسے سن کر ہی انسانیت کی گردن شرم سے جھک جاتی ہے:

''جیسے ہی بچے پیدا ہوتے یورے نس انہیں زمین کے اندرونی غاروں میں محبوس کر دیتا، انہیں باہر روشنی میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اپنے اس شیطانی عمل سے یورے نس بہت محظوظ ہوتا تھا''۔ (۴)

یورے نس کی بہ نسبت اس کی بیوی جیا دیوی کو اپنے بچوں سے محبت تھی اور وہ اپنے شوہر کی اس ظالمانہ شیطانی حرکت سے تنگ تھی۔ اس نے شوہر کو ظلم کا مزا چکھانے کے لیے لوہا پیدا کیا اور لوہے سے ایک درانتی بنائی۔ پھر اپنے بچوں کو اپنے ظالم صفت شوہر اور ان کے بے رحم باپ کے خلاف بھڑکایا۔ کرونس پہلے ہی اپنے باپ کا سخت مخالف تھا۔ وہ درانتی لے کر گھات میں بیٹھ رہا جب یورے نس اپنی بیوی جیا سے مباشرت کرنے آیا تو اس نے اپنے باپ کا عضوِ تناسل کاٹ کر اپنے انتقام کی پیاس بجھائی۔ اس دوران خون کا ایک قطرہ جیا کے رحم میں چلا جاتا ہے اور وہ اس موقع پر عجیب انداز سے حاملہ ہو جاتی ہے:

''کرونس نے کمین گاہ سے اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھایا اور یورے نس کا عضو اور دائیں ہاتھ میں درانتی تھامی اور جلدی سے باپ کا عضوِ تناسل کاٹ ڈالا۔ یورے نس کا جو خون بہا وہ جیا کے رحم میں جا پہنچا، وہ حاملہ ہو گئی اور اس کے نتیجے میں اس کے بطن سے انتقام کی تین دیویاں، ارنی، عفریت اور ت ایش درختوں کی پریاں پیدا ہوئیں''۔ (۵)

یورے نس کے بیٹوں میں سے کرونس نے ہی اقتدار سنبھالا اور اس طرح وہ دیوتاؤں کا پہلا حکمران بنا۔ اس نے اپنی بہن ریا سے شادی کی۔ اس کے ہاں تین لڑکیاں اور تین لڑکے پیدا ہوئے۔ اس کے باپ یورے نس اور ماں جیا نے پیش گوئی کی تھی، کہ کرونس کا اپنا بیٹا ہی اسے اقتدار سے معزول کرے گا۔ باپ کی پیش گوئی سن کر وہ ہوشیار ہو گیا۔ وہ کسی کو مسندِ حکومت پر نہیں دیکھ سکتا تھا، خواہ اس کا اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اس نے اپنے اقتدار کو مضبوط اور پائیدار بنانے کی انوکھی ترکیب نکالی۔ وہ بچوں پر ظلم کرنے میں اپنے باپ یورے نس سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ وہ بے رحم اپنے ہی بچوں کو نگل جاتا تھا:

''چناں چہ اس کے ہاں جیسے ہی کوئی بچہ رحمِ مادر سے ماں (ریا دیوی) کے گھٹنوں پر گرتا کرونس اسے نگل جاتا۔ اس طرح کرونس باری باری پہلے اپنی بیٹیوں، ہسٹیا، دمی تر اور ہیرا، پھر بیٹوں ہیڈز اور پوسیڈون کو ہڑپ کر گیا، زوس ابھی پیدا نہیں ہوا تھا''۔ (۶)

ریا دیوی بھی اپنی ماں کی طرح اپنے شوہر کرونس کی ظالمانہ حرکتوں سے تنگ آ چکی تھی۔ جب اس کے ہاں زوس پیدا ہونے والا تھا۔ وہ خفیہ طور پر بچے کو جن کر اپنے شوہر سے پہلے نگلے جانے والے بچوں کا بدلہ چکانا چاہتی تھی۔ دل میں سلگنے والی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس نے اپنی ماں جیا اور باپ یورے نس سے مشورہ طلب کیا تا کہ وہ بچے کو جن کر اسے تحفظ دے سکے:

''ان کے مشورے پر ریا کریٹ کے پہاڑ لائیکٹوس (Lyctos) پر چلی گئی اور رات کی گہری تاریکی میں زوس اس کے ہاں پیدا ہوا۔ پھر اس نے نوزائیدہ زوس کو جنگلوں سے ڈھکے پہاڑ ای جیون (Aegaeon) کے ڈکٹی (Dicte) نامی غار میں چھپا دیا اور زوس کے بدلے میں کرونس کو ایک پتھر بچے کے پوتڑوں میں لپیٹ کر دے دیا، وہ اسے نوزائیدہ سمجھ کر فوراً نگل

گیا''۔(۷)

تاریخ شاہد ہے کہ دیوتا صرف اپنے بچوں کو نگلتے یا غاروں میں قید ہی نہ کرتے بلکہ جنسی بھوک مٹانے کے لیے بہن اور بیٹی سے ہم بستری کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔فنیقیوں کے قدیم شہر بائبلوس میں استارتہ دیوی کا عظیم الشان مندر تھا۔جہاں ساحل کے قریب اونچے مقام پر استارتہ دیوی کا ہیکل قائم تھا۔یہ دیوی عشق ومحبت کی دیوی سمجھی جاتی تھی۔وہ ایک ایسے نوجوان پر عاشق ہوئی جس کا نام ایڈونی تھا اور ایڈونی کی پیدائش کے بارے میں کہا جاتا تھا۔کہ اس کے باپ سائرس نے جنسی خواہش مٹانے کے لیے اپنی بیٹی سے ہم بستری کی تھی:

''استارتہ کا افسانہ حسن وعشق پلوٹارک اور سائریل کی زبانی یہ ہے کہ فنیقیوں میں یہ قصہ مشہور تھا کہ سائرس (فرمانروائے قبرص کا لقب تھا) اپنی ایک حسین لڑکی مرہ (Myrrha) پر عاشق ہوگیا اور اس نے سالانہ جشنِ مسرت کے سلسلہ میں اس سے مباشرت کی اور ایڈونی (Adoni) ایک بچہ پیدا ہوا۔بعد کو سائرس اپنی اس قبیح حرکت پر سخت نادم ہوا اور اس نے اس بچہ کو پہاڑ پر پھنکوا دیا''۔(۸)

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے اور زیادہ غلہ اگانے کے لیے نہ صرف جانوروں (گھوڑے، بھینسے، بیل، بکریوں) کی قربانیاں دی جاتیں بلکہ انسانوں کا خون بھی بہایا جاتا تھا۔ظالم دیوتاؤں کی پیاس انسانی خون سے ہی بجھتی تھی۔اور تصور یہ تھا، کہ اس کے بدلے میں دیوتا انسانوں اور جانوروں کے لیے زیادہ سے زیادہ غلہ اگائیں گے۔لوگ دیوتا کی خوشی کے لیے اپنے نونہال بچے قربان کر دیتے تھے:

''اہل کارتھیج (قرطاجنہ) اپنے ناقابلِ تسخیر دیوتا بال کے قدموں میں بچوں کے علاوہ بڑوں کی جان کا حقیر نذرانہ بھی پیش کرتے تھے۔حالیہ یورپ جو آج اپنے تئیں مہذب اور متمدن کہلواتے پھولا نہیں سماتا اس کی مٹی کے ذرّے ذرّے سے انسانی لہو کی مہک آتی ہے۔جزائر برطانیہ اس سلسلے میں سب سے آگے تھا۔ابتدائی آئرلینڈ میں ہر سال ایک تہائی صحت منداور توانا بچے مادر قوتوں کے نام پر محض اس لیے قربان کر دیے جاتے کہ وہ ان کے قبائل اور مویشیوں کو دودھ اور غلہ فراہم کرتے۔کروم کروچ آئرلینڈ میں نوآبادکاروں کا محبوب ومرغوب دیوتا تھا۔لوگ ایرن (آئرلینڈ کا قدیمی نام) کے اس بادشاہ بت کے سامنے اشیا میں سے سب سے پہلی شے اور نونہال ہر قبیلہ کو قربان کرتے''۔(۹)

یوں تو حیات کی نمو یابی کے لیے کسی بھی چیز کی ضرورت وافادیت سے انکار ممکن نہیں لیکن بقائے حیات کا زیادہ تر دارومدار پانی پر ہے اور پانی کا حصول بغیر بارش کے ممکن نہیں ہوتا تھا۔بارش کے لیے دعائیں مانگی جاتی تھیں پھر بھی اگر بارش نہ برستی یا کم برستی تو زیادہ بارش برسوانے کے لیے بارش کے دیوتا کے حضور معصوم بچوں کی جانوں کی بھینٹ دی جاتی یا ان کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا:

''گرج چمک اور بارش کے دیوتا ٹلے لک (امریکی اندر) کو نہ صرف میکسیکو کی جھیلوں میں بلکہ

کوہساروں پر بھی نذرانے پیش کیے جاتے ۔ اور بچوں کی بھینٹ دی جاتی۔بعض ذبح کئے جاتے اور بعضوں کو جھیل میں زندہ غرق کر دیا جاتا۔ بچہ روتا تو سمجھتے بارش آنے والی ہے''۔ (۱۰)

امریکی دیوتاؤں یعنی وھٹ زل و پوچ ٹلی اور تزکٹ لی پوکا کی شان دار تقاریب انسانی خون کی ارزانی کی دہشت ناک داستان بیان کرتی ہیں۔اس عجیب وغریب اور انوکھی تقریب کا انعقاد سال میں دو مرتبہ دسمبر اور مئی میں ہوتا۔ یہ دیوتا بھی معصوم بچوں کا خون پی کر اپنی پیاس بجھاتے تھے:

''دسمبر کے تہوار کے موقع پر دیوتا کے پجاری بیج خوردنی پودوں اور نرم چوبی ٹکڑوں کو آٹے ،شہد اور قربان شدہ بچوں کے لہو میں گوندھ کر دیوتا کا مجسمہ بناتے جس کے سامنے بادشاہ خوشبوئیں جلاتا۔ دوسرے دن ایک پجاری سنگین پھل دار تیر سے دیوتا کا سینہ چیر کر دل نکالتا اور کھانے کے لیے اس کے ٹکڑے بادشاہ کو پیش کرتا۔باقی ماندہ مجسمے کو بوڑھے نوجوان لڑکے بالے اور بچے کھاتے۔ خواتین کے لیے یہ شجر ممنوع تھا''۔ (۱۱)

صرف دیوتا ہی نہیں بلکہ دیویوں کے حضور بھی بچوں کی قربانی دی جاتی تھی۔معصوم بچوں کے کچے لہو کی چاٹ ان کے منہ کو ایسی لگی تھی کہ ان کی پیاس صرف اور صرف معصوم بچوں کے خون سے ہی بجھتی تھی۔یعنی دیویاں بھی انسانی خون کی اتنی ہی پیاسی ہوتی تھیں جتنا کہ خود دیوتا پیاسے ہوتے تھے:

''وھٹ زل و پوچ ٹلی کی طرح اس کی بیوی ٹلے لک کو بھی بچوں کی قربانی کی احتیاج تھی۔وہ انسانی لہو ہی نہیں انسانی دلوں کو بھی چاہتی۔اس لیے اس کی ہر قربان گاہ خون میں ڈوبی رہتی''۔ (۱۲)

ازٹیک قبیلے کے دیوتا تزکٹ لی پو (وھٹ زل و پوچ ٹلی کا بھائی) کے اعزاز میں ہر برس بھرپور تقریب منعقد ہوتی تھی۔ میکسیکو کا ایک نوجوان اس دیوتا کا کردار سال بھر کے لیے ادا کرتا اور اس کی بہت حرمت کی جاتی تھی۔وہ اس قدر محترم ہوتا کہ اسے ایک ہی وقت میں بہت سی لڑکیوں سے پیار کرنے کا حق حاصل تھا۔سال کے اختتام پر اس نوجوان کا سر اڑا دیا جاتا اور دل چیر کر قربان کر دیا جاتا تھا، پھر مرد اور آدم خور کاہن اسے مزے لے لے کر کھاتے تھے:

''اہل پیرو کے ذوق وشوق اور جذبہ ایثار کا یہ عالم تھا کہ بخوشی اپنے لختِ جگر کو دو نیم کر دیتے اور پھر اس کے خون سے اپنے دیوتا کے چہرے کو گلرنگ بناتے اور مندروں کے دروازے میں رنگ بھر دیتے''۔ (۱۳)

انسانی قربانی کی ضرورت صرف بارش، یا کھیتی باڑی کے حصول، زیادہ فصلیں اگانے ،عمارتوں کی پختگی اور پائیداری تک ہی محدود نہ تھی ، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں پیش آنے والی مشکلات کا حل انسانی قربانی میں ہی سمجھا جاتا تھا اور انسان اپنے مطلب کی خاطر دیوتا کو خوش کرنے کے لیے انسان ہی کو قربان کر دیتا تھا اور اس کی قربانی مقبول تصور کی جاتی تھی۔اسی طرح طوفان میں گھرے بحری بیڑے کو بچانے کے لیے بھی انسانی قربانی کی ضرورت پیش آتی تھی:

''جب افروڈائٹی نے حسبِ وعدہ دنیا کی حسین ترین ہیلن کو پیرس (شہزادہ) نامی گڈریے کے سپرد کر دیا۔تو تمام ماحول مرتعش ہو گیا۔ہیلن کے سوئمبر میں شریک تمام سورما اس کی بازیابی کے

لیے ایک پرچم تلے جمع ہو گئے۔ مینی لاس کا بھائی ایگا میمنن سورماؤں کی اس فوج کا سپہ سالار تھا۔ یونانیوں کے بحری بیڑہ کو جب جزیرہ ایلس کے قریب مخالف ہواؤں نے گھیر لیا تو سالارِ لشکر ایگا میمنن کو دیوی ارٹمیس کی خوشنودی کی خاطر اپنی محبوب کنواری بیٹی ایفی جینیا کی قربانی دینا پڑی''۔ (۱۴)

جب انسان دیوتا کے نام پر قربانی دے دے کر تھک گیا تو اس نے کمال ہوشیاری سے دیوتا کے حضور اپنی جگہ پر جانوروں کو قربان کرنا شروع کر دیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دیوی ارٹیمس کی خوشنودی کے لیے قربان کی جانے والی ایفی جینیا کی جگہ بارہ سنگھا قربان کر دیا جاتا ہے اور ایفی جینیا زندہ بچ جاتی ہے۔ آرزو چوہدری کے خیال میں ایفی جینیا کی قربانی کا یہ واقعہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے واقعہ سے گہری مماثلت رکھتا ہے:

''ایفی جینیا کی قربانی کا یہ واقعہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے واقعہ سے قطعی مماثل ہے۔ وہاں حضرت اسماعیلؑ کی جگہ دنبہ قربان ہو جاتا ہے اور یہاں ارٹیمس دیوی، ایفی جینیا کو غائب کر کے اس کی جگہ بارہ سنگھا کو قربان ہونے کے لیے رکھ دیتی ہے''۔ (۱۵)

مذہبی نکتۂ نظر سے دیکھا جائے تو صرف دیوتا ہی نہیں بلکہ خدا بھی انسانی قربانی سے خوش ہوتا رہا ہے۔ دیگر تہذیبوں کی طرح عرب میں بھی خدا کی خوشنودی کی خاطر انسان کی قربانی کا دستور رہا ہے۔ عبدالمطلب کا اپنے دس بیٹوں میں سے عبداللہ (والد حضرت محمدؐ) کو قربان کرنے دینے کا عزم اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو سکتی ہے:

''انسانی قربانی میں دیوتا کو انسان یا دیوتا کا مثل ٹھہرا کر قربان کیا جاتا۔ ڈائی اینی سس کے حضور انسانی بدن کو پارہ پارہ کر دیا جاتا۔ بعض جگہوں پر اسی دیوتا کو بچے کا کچا لہو پیش کیا جاتا۔ یونانیوں کے خیال میں بچہ اور جوان دونوں دیوتا کی نمائندگی کرتے''۔ (۱۶)

دیوتا کی خوشنودی مقصود تھی یا خدا کی رضا مندی پیشِ نظر تھی، ہر دو صورت میں بے گناہ انسانوں کی قربانی اور معصوم بچوں کے خون کی ارزانی کا اندوہ ناک منظر دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ تصور عام تھا کہ جب تک انسانی لہو یا گوشت اور خاص کر بچوں کا کچا لہو نذر نہیں کیا جائے گا، کسی کام یا فرض کی تکمیل ممکن ہی نہیں۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مقدس فرض کی تکمیل کی غرض سے انسان قربان ہوتا رہا ہے۔ جبھی تو عمارتوں کی پختگی اور پائیداری کی خاطر معصوم بچوں کو یا ان کے تازہ خون عمارت کی بنیادوں میں دفن کرنے کی ظالمانہ رسم بھی رہی ہے:

''حتی کے بقول سامانیوں کی طرح عبرانیوں کے دور میں بھی عمارتوں کی بنیادوں میں بچوں کی تدفین کی جاتی۔ دستور عام کے مطابق بچوں کو سر کے بل برتنوں میں رکھ کر فرش پر رکھ دیا جاتا''۔ (۱۷)

بنجر زمینوں کی زرخیزی اور کھیتی باڑی کرنے اور زیادہ سے زیادہ فصل اگانے کے حصول کی خاطر حاملہ خواتین کے ہاتھوں سے بیج بجوائے جاتے تھے۔ یوں بھی کھیتی باڑی کا آغاز عورتوں کے سبزیاں اور پھل اگانے سے ہوا تھا۔ ممکن ہے یہ خیال اسی دور میں پروان چڑھا ہو اور پھر اساطیر کی صورت میں کھیتی باڑی سے چپک گیا ہو۔ عراق، یونان، مصر،

فونیقیا، اناطولیہ اور دریائے سندھ کی وادی سے اموی اور زرعی دور کی حاملہ مورتیاں برآمد ہوئی ہیں۔جنہیں دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان کی غرض وغایت کیا تھی:

''عمرانیات کے عالموں نے ان مورتیوں کو مادرِ ارض کا لقب دیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ابتدائی زرعی عہد میں یہ مورتیاں زرعی پیداوار کی افزائش کے ساحرانہ رسوم میں استعمال ہوتی تھیں کیونکہ اس زمانے کے لوگوں کے نزدیک عورت کا تخلیقی عمل اور زمین کی زرخیزی کا عمل ایک ہی حقیقت کے دو رخ سمجھے جاتے تھے''۔(۱۸)

جن خواتین کی گود ہری ہوتی تھی انہی کے ہاتھ سے کھیتوں میں بیج بوائے جاتے تھے۔تصور تھا کہ حاملہ عورت کے بیج بونے سے ایک ایک بیج کی جگہ کئی کئی دانے پیدا ہوں گے۔بانجھ عورت کو کھیت سے دور رکھا جاتا تھا۔عام خیال تھا کہ ایسی عورت اگر بیج بوئے گی تو کھیت بنجر ہو جائے گا۔سبطِ حسن نے اپنی تصنیف ماضی کے مزار میں سر جان فریزر کی شہرہ آفاق تصنیف ''شاخِ زریں'' (Golden bough) سے ایک حوالہ دیا ہے جسے ہم حوالہ ثانی کے طور پر درج کرتے ہیں۔جب ایک پادری نے نیکو قبیلے کی عورتوں کو بچے سینے سے لگائے دھوپ میں بیج بوتے دیکھا تو ناراض ہو کر کہا تھا:

''تم لوگ بے رحم ہو،تمہاری عورتیں سخت دھوپ میں بچوں کو سینے سے لگائے بیج بوتی رہتی ہیں اور تم ان کی بالکل مدد نہیں کرتے۔قبیلے والوں نے پادری کو جواب دیا کہ مقدس باپ آپ اس بات کو نہیں سمجھتے۔آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ عورتیں بچے پیدا کرتی ہیں لیکن ہم بچے پیدا نہیں کر سکتے۔جب عورتیں بیج بوتی ہیں تو جوار کے پودوں میں دو دو تین بھٹے لگتے ہیں اور آلو کی جڑ سے دو دو تین تین ٹوکری آلو نکلتا ہے۔بتایئے ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ عورتیں بچے پیدا کرنا جانتی ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ بیج سے اناج افراط سے کیسے پیدا کیا جاتا ہے۔پس انہیں بیج بونے دیجیے۔جتنا وہ جانتی ہیں ہم نہیں جانتے''۔(۱۹)

تاریخ انسانی میں بچوں کی تربیت کے نام پر ایسے ظالمانہ قوانین بھی بنائے جاتے رہے ہیں۔جن کو پڑھ کر دل دہل جاتا ہے۔اس زمانے کا تصور کر کے دماغ شل ہو جاتا ہے اور آنکھیں خون کے آنسو روتی ہیں۔ہر طرف معصوم انسانیت بلکتی نظر آتی ہے۔قدیم یونان میں بچوں کی تہذیب کے لیے اسپارٹا کا اپنا ایک خاص آئین تھا۔

''اسپارٹنوں کی روزمرہ کی زندگی اور رسم ورواج کا تمام تر رخ ایک ہی مقصد کی طرف تھا۔فوجی تربیت کی طرف۔سات برس کی عمر سے بچوں کو تعلیم گاہ میں بھیج دیا جاتا تھا جہاں ان کو جرات ،پیش قدمی ،قوتِ برداشت کی تعلیم دی جاتی تھی اور جہاں زیادہ زور جسمانی تربیت پر دیا جاتا تھا''۔(۲۰)

سپارٹا میں لائی کرگس کی اصلاحات نے ہر اسپارٹن کے اندر فوجی جذبہ بیدار کر دیا تھا،اور ان کے اندر بہادری کے جوہر نمایاں کر دیے تھے۔اس کا کہنا تھا شہریوں کا وجود ریاست کے تحفظ اور مفاد کا ضامن ہے نہ کہ ریاست شہریوں کی۔اس کے نزدیک ہر فرد کی زندگی ریاست کے آئین کے ماتحت تھی۔کسی شہری کو آزادی کے نام پر من مانی کرنے کی اجازت نہ

تھی۔ بالخصوص نوزائیدہ بچوں کی تربیت پر بڑی توجہ دی جاتی تھی۔ اس حوالے سے ریاست کلی طور پر مختار تھی۔

''پیدا ہوتے ہی ہر بچے کا معائنہ کیا جاتا اگر وہ جسمانی طور پر کمزور ہوتا تو اسے مرنے کے لیے پہاڑوں پر چھوڑ دیا جاتا۔ سات برس کی عمر میں ہر بچے کو ریاست کے سپرد کر دیا جاتا۔ ریاست اسے فوجی تربیت دیتی۔''(۲۱)

دیوتاؤں کی خوشنودی اور تکریم وتحریم کے بعد ریاستی آئین کی توقیر بہت لازم تھی۔ آئین کے احترام کے سامنے انسانیت کی کچھ خاص قدر و وقعت نہ تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سپارٹا میں بچوں کی صحت وتندرستی جانچنے کا اپنا ایک طریق تھا۔ جس کے نتیجے میں طفل کشی کی ایسی ظالمانہ رسم وجود میں آئی جس نے سپارٹا کی فضا اور آسمان کو شفق گوں بنا دیا تھا:

''جب کسی گھرانے میں کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اسے محبِ وطن منصفین کے سامنے پیش کیا جاتا۔ وہ اس بچے کی بدنی ساخت وصحت کا جائزہ لیتے۔ بچہ معیار پر پورا اترتا تو تحفظ وطن کی غرض سے ریاست کو سونپ دیا جاتا۔ دوسری صورت میں اس معصوم کو پتھروں کی سلوں پر پٹخ پٹخ کر ریاست کے نام پر قربان کر دیا جاتا''۔(۲۲)

ہم دیکھتے ہیں کہ صرف دیوتا ہی بچوں کو نگلنے یا ان کے خون کے طلب گار نہ تھے، بلکہ حصول اقتدار اور اقتدار کو طول دینے کے لیے بھی بچوں سے ناروا سلوک کیا جاتا رہا ہے۔ روم کے شہر البالونگا کے ایک بادشاہ کو اس کے بھائی نے زبردستی تخت سے اتار دیا اور خود تخت نشین ہو گیا۔ اس کی بیٹی رئیا سلویا کو ویستا دیوی کی دوشیزہ بنا دیا، اس طرح اسے تاحیات کنواری رہنے کی قسم کھانی پڑی تھی۔ جب رئیا سلویا کے ہاں جڑواں بچے پیدا ہوتے ہیں تو بادشاہ ان کو دریا میں غرق کر دینے کا حکم دیتا ہے۔ لیکن بچے حسنِ اتفاق سے بچ جاتے ہیں اور جوان ہو کر غاصب بادشاہ کا دھڑن تختہ کر کے اپنے نانا کو پھر اسی تخت پر بٹھا دیتے ہیں:

''مگر تھوڑے ہی دنوں میں رئیا سلویا کے ہاں جڑواں لڑکے پیدا ہوئے اور بادشاہ نے طیش میں آ کر حکم دیا کہ انہیں دریا میں غرق کر دیا جائے۔ ایک غلام انہیں ٹوکری میں رکھ کر دریا کے کنارے لے گیا اور ٹوکری پانی میں ڈال دی۔ لیکن وہ دریا میں ڈوبے نہیں بلکہ لہروں نے انہیں کنارے پر انجیر کے درخت کے نیچے پہنچا دیا جہاں ایک مادہ بھیڑیئے نے انہیں اپنا دودھ پلایا۔ پھر ان بچوں کو ایک گڈریا اٹھا لے گیا جس نے انہیں پالا پوسا''۔(۲۳)

جب فرعون نے دیکھا کہ بنی اسرائیل کی تعداد مصر میں بڑھتی ہی جا رہی ہے اور ان کی عزت بھی ہے تو اس نے آنے والے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے بنی اسرائیل کی آبادی کو کم کرنے کی ظالمانہ تجویز سوچی۔ اس کا حکم تھا کہ بنی اسرائیل میں جو بچہ پیدا ہو اس کو فوراً قتل کر دیا جائے:

''جب بنی اسرائیل کے افراد نے اپنی محنت اور دیانت سے مصر میں نام پیدا کر لیا تو فرعون کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اب اس قوم کی تعداد کو کم کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو اسے زندہ نہ رہنے دیا جائے۔ اس حکم پر سختی کے ساتھ عمل کئے جانے کے باوجود

حضرت موسیٰ زندہ رہے اور شاہی محلوں میں پرورش پاتے رہے۔'' (۲۴)

جب فرعون نے بچوں کے بے دریغ قتل کا حکم دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے ان کو قتل کیے جانے کے ڈر سے صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دیا تھا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے، ترجمہ:

''ہم نے اسے سمجھایا تھا کہ بچے کو ایک صندوق میں ڈال دے اور صندوق کو دریا میں چھوڑ دے''۔ (۲۵)

رئیا سلویا کے بچوں کو ٹوکری میں رکھ کر اور موسیٰؑ کو صندوق میں رکھ کر پانی میں بہا دینے والے واقعے میں گہری مماثلت ہے۔ چین میں سن خاندان کی حکومت کے خاتمے کے بعد لیو پانگ نے ہان خاندان کی بنیاد رکھی، اور شہنشاہ بنتے ہی کاتسو کا لقب اختیار کیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ہولیتی تخت نشین ہوا، وہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہا۔ اس کے بعد ہولیتی کی ماں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور اپنے بھائیوں اور رشتے داروں کو بڑے بڑے عہدوں پو مامور کیا۔ چونکہ ہان خاندان کا تخت خالی تھا اور شہنشاہ کا ہونا ضروری تھا، اس لیے اقتدار کو بچانے کے لیے ہولیتی کی ماں نے ایک انوکھی ترکیب تراشی۔ جب بچہ بالغ ہو کر اقتدار کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا تو اس پاداش میں اس کو قید کر دیا گیا تھا:

''چونکہ چینی تخت پر شہنشاہ کا ہونا ضروری تھا اس لیے اس نے اپنے متوفی بیٹے ہولیتی کے ایک فرضی بچے کو اس کا جانشین ظاہر کیا۔ لیکن عنان حکومت بدستور اس کے ہاتھ میں رہی۔ جب بچہ بالغ ہوا تو اس نے اقتدار کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے اس پر اسے محل میں قید کر دیا گیا اب وہ کسی ایسے جانشین کی فکر میں تھی جو اس کے اشاروں پر ناچتا رہے''۔ (۲۶)

پدرم سلطان بود کے مصداق بادشاہ کا بیٹا ہی تخت نشینی کا حق رکھتا ہے۔ یہ تخت نشینی میراث بن کر نسل در نسل چلتی رہتی ہے۔ کسی دوسرے کو تخت کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا جاتا البتہ اس کی خاطر شمشیر زنی سے کام لیا جا سکتا تھا۔ سلطان ظہیر الدین بابر کے بارے میں کہا جاتا ہے:

''وہ اپنے باپ عمر شیخ مرزا کی اچانک موت پر گیارہ برس کی عمر میں فرغانہ کے تخت پر بیٹھا''۔ (۲۷)

ایک ریاست میں جب کوئی قانون یا رسم پروان چڑھتی ہے تو اردگرد کی ریاستیں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ پڑوس میں خوشی کے شادیانے بجتے ہوں یا جنگ کے بادل منڈلاتے ہوں، فاقہ کشی کا عالم ہو یا خوش حالی کے اسباب ہوں، یہ سب اسباب پاس پڑوس کے ماحول پر شدت سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہم جان چکے ہیں کہ اسپارٹا کی ریاست میں بچوں کی تربیت کے حوالے سے ایک انوکھا دستور رائج تھا۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ اسپارٹا ہی کی ریاست سے متاثر ہو کر افلاطون نے اپنی مثالی ریاست میں بچوں کی تربیت اس طرح کرنا چاہی تھی:

''ہاں، تو افسر جن کا یہ کام ہوا چھے والدین کے بچوں کو باڑے میں لے جائیں گے اور انھیں آیاؤں کے سپرد کر دیں گے، یہ آیائیں علیحدہ مکانوں میں رہا کریں گی۔ کم درجے والے لوگوں کی اولاد یا اچھوں کی وہ اولاد جو اتفاق سے بگڑ گئی ہو انہیں کسی مخفی نامعلوم مقام پر ڈال دیا جائے گا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ اسی کے مستحق بھی ہیں''۔ (۲۸)

افلاطون اپنی مثالی ریاست میں جہاں بچوں کی تربیت پر زور دیتا ہے اور بگڑے بچوں کو مار ڈالنے کا حکم لگاتا ہے

وہیں حکمران طبقے کے لیے بھی کچھ شرائط عائد کرتا ہے۔اس کڑے انتخاب کے لیے افلاطون یہاں تک کہتا ہے:

''ہمارے محافظوں کی بیویاں مشترک ہوں ، بچے مشترک ہوں ،ماں باپ اپنے بچوں کو نہ پہچانیں، نہ بچے اپنے ماں باپ کو۔''(۲۹)

افلاطون حکمرانوں کے درمیان باہمی فضا کو خوشگوار بنانے اور عمال کو رشوت ستانی اور اقربا پروری سے دور رکھنے کے لیے مشترک خاندان کی اہمیت دیتا ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں اس اقدام کے بغیر مثالی ریاست کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا:

''کسی مثالی ریاست میں وہ قائدین جن کو حکمرانی کے لیے منتخب کیا گیا ہو ان کے اپنے پاس نہ تو کوئی ذاتی ملکیت ہو اور نہ ہی ان کا کوئی خاندان ہو، تاہم یہ لوگ جس آبادی میں رہ رہا ہوں باہم میل جول کی فضا ہو ۔ جہاں بیویاں اور بچے ایک دوسرے کی مشترکہ ملکیت ہوں تا کہ اس اشتراک کی بنیاد پر ضمانت دی جا سکے کہ عمال حکومت کے درمیان کسی قسم کی بدعنوانی، رشوت ستانی اور مختلف خاندانوں کا اپنے اپنے خاندانوں کے ساتھ اقربا پرستانہ رویہ موجود نہ ہو۔''(۳۰)

ذہین بچے پیدا کرنے کے لیے افلاطون بہترین مرد و خواتین کے اختلاط کو جائز سمجھتا تھا خواہ ان کا تعلق کسی بھی نسل یا خاندان سے ہو۔اسی طرح بے کار یعنی کند ذہن بچوں کی پرورش نہ کرنے کا اس کا فیصلہ قطعی تھا۔ بے شک وہ اعلیٰ نسل سے ہی تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں۔اس کا مقصد ایسے ذہین بچے پیدا کرنا تھا، جو ریاست کی خدمت کر سکیں اور کند ذہن بچوں کو وہ ریاست پر بوجھ سمجھتا تھا:

''یہ اصول تو ہم بیان کر ہی چکے ہیں کہ ایک صنف کے بہترین افراد کو دوسری صنف کے بہترین افراد سے جتنے زیادہ مرتبہ ہو سکے ملایا جائے اور دونوں صنفوں کے بدترین افراد کو جتنا بھی کم ہو سکے، اور گلے کو اعلیٰ درجے کی حالت میں رکھنا منظور ہے تو صرف اوّل الذکر سے جو بچے پیدا ہوں ان کی پرورش کرنی چاہیے دوسروں کی نہیں''۔(۳۱)

افلاطون بچوں کو ذہنی اور جسمانی سطح پر اس قدر جنگ کے لیے تیار کرنا چاہتا تھا، کہ وہ جنگ کا منظر دکھانے کے لیے بچوں کو میدان جنگ میں بھیجنے کو اہمیت دیتا تھا۔ جیسے اس کے نزدیک بچوں کو میدانِ جنگ میں بھیجنا ایسا ہی تھا جیسے میلے میں بھیج دینا۔ درحقیقت وہ کم عمر بچوں میں اعتماد پیدا کرنا چاہتا تھا اور جنگ کے خوف ناک مناظر دکھا کر ان میں جرات، حوصلہ اور عزم پیدا کرنے کا آرزومند تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بچے اپنے والدین کو جو کام کرتے دیکھتے ہیں، وہ اس کو جلد سیکھ لیتے ہیں:

''یہ سب مل کر مہم پر جایا کریں گے۔ جو بچے کافی مضبوط ہیں انھیں اپنے ساتھ لے جائیں گے تا کہ کاریگروں کے بچوں کی طرح یہ بچے بھی اپنی آنکھ سے اس کام کو دیکھ لیں جو بڑے ہو کر انہیں کرنا ہے۔اور یہی نہیں کہ یہ بچے صرف جنگ کا نظارہ کر لیں بلکہ جنگ میں مدد بھی دیں گے، کار آمد ثابت ہوں گے اور اپنے والدین کی خدمت کریں گے۔تم نے مشاہدہ نہیں کیا کہ کمہار کے

بچے چاک کو ہاتھ لگانے سے بہت پہلے اپنے والدین کو کام کرتے دیکھتے اور ان کی مدد کرتے ہیں''۔ (۳۲)

یہ حقیقت ہے کہ پیدا ہونے والے بچوں میں بے پناہ صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ بہت کم بچے فطری لحاظ سے کند ذہن یا اپاہج ہوتے ہیں۔ بچے کی ظاہری و باطنی صلاحیتوں کے بروئے کار لانے کا انحصار سماج پر ہوتا ہے نہ کہ بچے پر۔ اگر بچے کی رہنمائی کرنے والا خود کامل ہو تو بچے کی صلاحیتوں کا رخ مثبت چیزوں کی طرف موڑ دیتا ہے اور بچہ مفید شہری بن جاتا ہے۔ دوسری صورت میں بچے کی صلاحیتیں برباد ہو جاتی ہیں اور معاشرے کے لیے اس کا ناسور ہونا یقینی بات ہے:

''انسانی بچہ پیدائشی طور پر ایسی اہلیتوں، قابلیتوں اور خصوصیات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی بچپن کی معاشریت کے ذریعے اسے اس کی ثقافت کا ایک مفید شہری یا سماج دشمن شہری بنایا جا سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں بچپن کی معاشریت کے ذریعے بچے کی معاشریت کی سمت کو متعین کیا جا سکتا ہے''۔ (۳۳)

بچوں کی تربیت کا بیڑا اٹھانے والوں کے پیشِ نظر یہ بات رہنی چاہیے کہ ان کی اندرونی صلاحیتوں کو اجالنے اور پرکھنے کے لیے ان کی نفسیات کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اس کی نفسیات کا ادراک کیے بغیر آپ اس کی تعلیم و تربیت بہتر انداز میں نہیں کر سکتے۔ اس کو بہتر اور مفید شہری بنانے کے لیے اس کی نفسیات کا مطالعہ لازم ہے۔ اس سلسلے میں ریاست اور اساتذہ سے کہیں زیادہ والدین کی توجہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے:

''بچپن کی زندگی کو نفسیاتی طور پر ہم کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے، ماحول شخصیت کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیتا ہے، بچے کو جس قسم کا ماحول میسر ہو اس کی شخصیت اسی طرح پروان چڑھتی ہے۔ والدین ہی بچے کے ماحول کی تشکیل کرتے ہیں۔ ایک اچھا بچہ اچھے عادات و اطوار کا مالک کس طرح بن سکتا ہے اور برے عادات و اطوار کی روک تھام کس طرح کی جا سکتی ہے؟۔ یہ تمام سوالات بچے کی ابتدائی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں''۔ (۳۴)

سکندر نے ہندوستان کی کامیاب مہم سے واپسی پر سوفائٹیز ریاست کو اپنا مطیع بنانے کے لیے ظلم و جور کا بازار گرم کیا تھا۔ ہر چند مقامی لوگوں نے بھرپور مزاحمت کی لیکن وہ سکندر کی طاقت ور فوج کے آگے زیادہ دیر تک جم نہ سکے۔ اس خوف سے کہ سکندر ان کی عورتوں کو باندیاں اور بچوں کو غلام بنا لے گا، انہوں نے اپنے گھروں کو آگ لگا دی اور بیوی بچوں سمیت خود اپنے کو نذرِ آتش کر دیا تھا۔ سوفائٹیز کی ریاست کے لوگ عقل و دانش والے تھے ان کے رسم رواج میں حد درجہ شائستگی تھی اور وہ حسن و جمال کا اس قدر لحاظ رکھتے تھے کہ ان کی شادیوں میں نسلی امتیاز کی کوئی حیثیت نہیں تھی، بلکہ شکل و صورت معیار سمجھی جاتی تھی۔ وہ اپنے ہاں پیدا ہونے والے بچے کا طبی معائنہ ضرور کرواتے، اگر کسی بچے کے اعضا میں کوئی عیب ہوتا تو اسے ختم کر ڈالتے تھے۔

''مثال کے طور پر ہمیں معلوم ہوا ہے کہ سوفائٹیز کی ریاست کے لوگ اس قدر حسن پرست واقع ہوئے تھے کہ اگر کسی نوزائیدہ بچے میں جسمانی عیب ہوتا یا کوئی خرابی ہوتی اسے مروا ڈالا جاتا تھا اور

اسے پلنے بڑھنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی''۔ **(۳۵)**

کھیوڑا (وسطی پنجاب) کے رسم و رواج اور بالخصوص نومولد بچوں کی تربیت کے حوالے سے سبطِ حسن نے اپنی کتاب'' پاکستان میں تہذیب کا ارتقا'' میں'' کونٹس کریٹس منقول از ووڈ کاک ص ۳۶'' کا حوالہ دیا ہے، جسے ہم ثانوی حوالے کے طور پر نقل کرتے ہیں:

> ''یہاں بچوں کی تربیت والدین کی مرضی سے نہیں ہوتی اور نہ بچوں پر ان کا حکم چلتا ہے بلکہ ان کی نگرانی سرکاری بَید (ڈاکٹر) کرتے ہیں۔اور اگر بچہ لولا لنگڑا پیدا ہو تو اسے ہلاک کر دیتے ہیں۔ شادی بیاہ میں بھی یہ لوگ اونچی نیچی ذات کی پروا نہیں کرتے بلکہ انتخاب کا معیار صورت شکل اور تندرستی ہوتا ہے کیونکہ ان میں بچوں کی خوبصورتی پر بڑی توجہ دی جاتی ہے''۔ **(۳۶)**

بقراط بچپن سے ہی فنِ طب کی طرف مائل تھا۔اس فن میں مہارت حاصل کر لینے کے بعد اس نے یہ فن نوجوانوں میں عام کرنے کی کوشش کی لیکن وہ یہ فن سیکھنے والوں پر ایک شرط عائد کرتا تھا۔وہ یہ کہ سیکھنے والے فن سیکھ کر عورتوں کے حمل گرانے میں معاون نہیں ہوں گے، وہ خود بھی اس بری بات سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔اس کے فنِ طب میں دلچسپی کے حوالے سے باری علیگ نے''انسانی تمدّن کی داستان'' میں انگریزی زبان کے ایک طویل اقتباس کا ترجمہ نقل کیا ہے، جسے حوالہ ثانی کے طور پر درج کیا جاتا ہے:

> ''میں شافی اپولو اور دوسرے دیوی دیوتاؤں کی قسم کھا کر یہ کہتا ہوں کہ جو شخص مجھے یہ (طب) فن سکھائے گا میں اسے اپنے ماں باپ کے برابر سمجھوں گا۔۔۔اور اس کے بیٹوں کو اپنا بھائی خیال کرتا ہوا انہیں یہ فن مفت سکھاؤں گا۔بشرطیکہ وہ اسے سیکھنا چاہیں۔میں صرف ان لوگوں کو اس فن میں اپنا شاگرد بناؤں گا جو یہی سوگند اٹھائیں گے۔اگر مجھ سے یہ کہا جائے گا کہ میں کسی شخص کو مہلک دوا دوں تو میں ایسا نہیں کروں گا۔اور نہ میں اس قسم کے مشوروں میں شامل ہوں گا۔میں کسی عورت کا حمل گرائے جانے میں مددگار نہیں بنوں گا''۔ **(۳۷)**

افلاطون کی مثالی ریاست میں تمام شہریوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ریاست پر ہے۔ہر فرد خواہ معاشرے کے کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو اس کی تعلیم و تربیت لازمی ہے تاکہ ان کو اپنی اپنی فطری صلاحیتوں کو نکھارنے اور کام میں لانے کے یکساں مواقع مل سکیں۔اس طرح ہر فرد کے لیے اپنے آپ کو زیادہ باصلاحیت ثابت کرنا آسان ہوتا ہے۔بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ان کی عمروں کو ادوار میں تقسیم کیا گیا تھا۔تاکہ کوئی بچہ صحتِ جسمانی اور ذہنی تربیت سے محروم نہ رہ سکے:

> ''افلاطون کی جمہوریہ میں بچپن کے ابتدائی دور کی تعلیم کے لیے جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ انسان کی جسمانی صحت ہے۔تین سال کی عمر سے لے کر چھ سال کی عمر تک ضروری یہ ہے کہ بچوں کو اساطیری کہانیوں سے مانوس کر دیا جائے۔۔۔۔یعنی بہ الفاظِ دیگر افلاطون کے نزدیک مذہبی تعلیم بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور پھر سات سال کی عمر سے لے کر دس سال کی عمر تک بچوں کو کھیل کود کی طرف مائل کیا جانا چاہیے۔دس سال سے تیرہ سال تک بچوں کو لکھنا اور

پڑھنا سکھانا چاہیے۔ چودہ سال کی عمر سے لے کر سولہ سال کی عمر تک شاعری اور موسیقی کا ذوق دلایا جانا چاہیے''۔ (۳۸)

افلاطون اپنی مثالی ریاست میں مرد و خواتین (دونوں کی) تعلیم و تربیت پر زور دیتا ہے۔ وہ تعلیم و تربیت جیسی نعمت سے ہر شہری کو بہرہ مند ہونے کی خواہش کرتا ہے اور عورت کے معاملے میں تو اس کا رویہ بہت سخت قسم کا تھا۔ وہ بچے پیدا کرنے کا حق صرف انہی خواتین کو دینے کے حق میں تھا، جو پڑھی لکھی ہوں۔ وہ ان پڑھ اور غیر تربیت یافتہ عورت کو بچہ پیدا کرنے کی اجازت دینے کا روادار نہیں تھا:

''کسی مثالی ریاست کے حصول میں یہ بات بھی بطور خاص بڑی اہم ہے کہ ان معزز فلاسفہ کے گروہ میں یکساں تعلیم و صلاحیتوں کی حامل خواتین کو بھی ان کا حصہ ضرور دیا جانا چاہیے۔ ان خواتین کو بچے جننے کی لازمی و خصوصی تربیت بھی دی جانی چاہیے۔ ان خواتین کو یہ بات بار بار باور کرادی جانی چاہیے کہ ماں کی حیثیت میں فطرت کی جانب سے انہیں اس منصب پر فائز اس لیے کیا گیا ہے کہ مستقبل کے لیے افزائش نسل کی تن تنہا ذمہ داری صرف ان ہی کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے، کیونکہ ریاست میں مستقبل کے معماروں کی حیثیت سے عمدہ شہریوں کا پیدا ہونا ان ہی ماں کے ذمہ ہے اور اگر ان ماؤں نے اپنی ذمہ داری سے سرِ مو بھی چشم پوشی اختیار کی تو ایسی صورت میں ریاست کو نا قابل تلافی نقصان پہنچنے کی ساری ذمہ داری ان ہی ماؤں کے سر عائد ہو گی''۔ (۳۹)

ہر عہد میں دو چار لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو جہالت کو سماج کی ترقی کے راستے میں بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں اور وہ انسانوں کی تعلیم و تربیت پر زور دیتے نظر آتے ہیں۔ بالخصوص بچوں کی تعلیم و تربیت پر دھیان دینے کی بات کرتے ہیں، کیونکہ آج کے بچے کل کا مستقبل ہوتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بچپن کا زمانہ ہی کارآمد ہوتا ہے۔ اس عمر میں سیکھنے کی طرف رجحان قابلِ ستائش ہوتا ہے۔ افلاطون کے شاگردِ رشید ارسطو نے بھی بچوں کی تعلیم و تربیت پر بہت زور دیا تھا، اس کا کہنا تھا کہ ریاست کے مستقبل کی خاطر بچوں کی تربیت پر خصوصی توجہ دی جانی چاہیے۔ کیونکہ ریاست کا مستقبل انہی بچوں کے ہاتھ میں ہے:

''ارسطو کا خیال تھا کہ بچوں کو صحیح معنوں میں حصول تعلیم کے بہترین مواقع ملنے چاہیں تاکہ آئندہ چل کر اپنی ریاست کے بہترین شہری بن سکیں۔ اور ان کے پیش نظر صرف یہ ایک مقصد ہو کہ وہ خیر عامہ کے لیے ہی کام کریں گے۔ اور اپنی توانائیاں اپنے ذاتی مفادات کے حصول میں ضائع نہ کریں گے۔ ارسطو کی تجویز ہے کہ بچوں کو ابتداً جو مضامین پڑھائے جانے چاہیں ان میں گرامر، کھیل کود، موسیقی اور ڈرائنگ سرفہرست ہیں''۔ (۴۰)

سکندرِ اعظم نے بڑی بڑی فتوحات حاصل کرنے کے لیے غیض و غضب بھی دکھایا، لیکن اس کے باوجود اس کی طبیعت میں صلح جویانہ روش تھی۔ وہ ایسی تہذیب پیدا کرنے کا خواہاں تھا، جو ایران اور یونان کی تہذیبوں کا آمیزہ ہو۔ اس

نے یونانیوں کو ایشیا اور ایشیاؤں کو یونان میں بسایا اور خود دارا کی بیٹی سے شادی کی، ایرانی لباس پہنا اور ایرانی طرز کا دربار لگایا۔ وہ دو تہذیبوں کو آمیخت کرنے اور ان کے رسوم و رواج کو ہم آہنگ کرنے کے لیے، دو نسل کے لوگوں کو یکساں فوجی تربیت دینا چاہتا تھا، جس کی یونانیوں نے بہت مخالفت کی تھی لیکن سکندر نے اس مزاحمت کو سختی سے کچل دیا تھا۔ اس کی دور اندیشی ملاحظہ ہو کہ اس نے دو تہذیبوں کی آمیزش کے لیے سب سے زیادہ بچوں کی یکساں تعلیم و تربیت پر توجہ دینا چاہی تھی:

''اس نے تیس ہزار ایرانی بچوں کو یونانی سکولوں میں بھجوا دیا تھا''۔ (۴۱)

بچیوں کی کم عمری میں شادی کا رواج بھی صدیوں پرانا ہے۔ آج بھی بہت سے ان پڑھ خاندان اور قبیلے ایسے ہیں، جو بچیوں کی شادی بالکل اوائل عمری میں کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ شادی کے سرخ جوڑے میں ملبوس بچی شادی کے معنی سے بھی آشنا نہیں ہوتی۔ شاید اس کے نزدیک شادی ''گڈے'' اور ''گڈی'' کا کھیل ہی ہوتا ہے۔ دھرم شاستروں میں لکھا ہے کہ جہاں عورتوں کی عزت (پرستش) کی جاتی ہے، وہاں دیوتاؤں کی برکتیں نازل ہوتی ہیں۔ جہاں ان کی عزت نہیں کی جاتی وہاں تمام کام بے نتیجہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہیں عورتوں کو گمراہ کرنے والیاں بتایا گیا ہے اور ان کی اوائل عمری کی شادی پر زور دیا گیا ہے:

''وہ بارہ سال یا آٹھ سال کی عمر میں لڑکی کی شادی کو جائز قرار دیتے ہیں''۔ (۴۲)

بچیوں کی کم عمری میں شادی کا رواج ہندوستانی تہذیب میں ہی نہیں بلکہ عرب میں بھی لڑکیوں کی کم سنی میں شادی کرنے کے ثبوت ملتے ہیں۔ حضرتِ عائشہؓ کا نکاح اور رخصتی کم سنی میں ہوئی تھی۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ جغرافیائی سطح پر تبدیلیِ آب و ہوا اور گرم و سرد ماحول بچوں کی بلوغت پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ بہر حال یہ بات ابھی بھی تحقیق طلب ہے، کیونکہ تدوینِ احادیث کا کام آپؐ کے وصال کے قریباً دو سو سال بعد شروع ہوا تھا:

''ہجرت سے تین سال قبل ماہ شوال میں نکاح ہوا، حضرتِ عائشہؓ کی عمر اس وقت چھ سال تھی۔ ہجرت کے آٹھ مہینہ بعد شوال ہی کے مہینے میں رخصتی اور عروسی کی رسم ادا ہوئی۔ اس وقت آپؓ کی عمر نو سال اور کچھ ماہ تھی''۔ (۴۳)

تاریخی مطالعہ سے یہ بھی پتا چلتا ہے ٹیکسلا اور سیالکوٹ میں سنسکرت ناٹکوں کی منڈلیوں میں یونانی ڈرامے پیش کیے جاتے تھے اور ان میں راجاؤں کا محافظ دستہ یونانی عورتوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ راجے مقامی سپاہیوں سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ ان کو اپنی حفاظت کے لیے غیر ملکی عورتوں کو ملازم رکھنا پڑتا تھا۔ یہی کچھ صورتِ حال ترکی کے سلاطین کی تھی۔

''یہی حال سلاطین ترکی کا تھا جو بلقان کے دور دراز علاقوں سے کم سن لڑکوں کو غلام بنا کر لاتے اور جب لڑکے تربیت پا کر جوان ہو جاتے تو ان کو ''جاں نثاروں'' میں شامل کر لیتے۔ یہی ''جاں نثار'' بعد میں سلطنت کے زوال کا سبب بنے''۔ (۴۴)

اللہ کے حکم سے جب تکوینی علم کے اسرار جاننے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ سفر کیا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ان کے ساتھ ہم سفری کی شرط خاموشی اختیار کر نا رکھی تھی۔ یعنی کہ وہ جو کچھ بھی دیکھیں تو خاموش رہیں لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی بات پر قائم نہ رہ سکے تھے۔ جب خضر علیہ السلام نے کشتی میں

سوراخ کیا تو موسیٰ علیہ السلام تڑپ اٹھے۔ جب ان کو نہ بولنے کا وعدہ یاد دلایا تو پھر چپ رہنے کا وعدہ کرلیا۔ جب دیوار گرا کر اس کی نئے سرے سے تعمیر کی تو موسیٰ علیہ السلام نے پھر لب کشائی کی۔ یاد دلانے پر پھر چپ رہنے کا اعادہ کیا۔ میدان میں بچے کھیل رہے تھے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک بچے کو قتل کر دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پھر چپ نہ رہا گیا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے بچے کو قتل کرنے کا یہ جواز پیش کیا تھا:

''رہا لڑکے کا معاملہ تو اس کے والدین مومن تھے۔ اور مجھے اندیشہ ہوا۔ کہ یہ لڑکا سرکشی اور کفر سے انہیں نقصان پہنچائے گا''۔ (۴۵)

بعضے عرب افلاس کے ڈر سے بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ یہ قبیح اور سفاکانہ طریقہ مختلف وجوہ سے رائج ہوا تھا۔ لڑکیوں کو بوجھ سمجھا جاتا تھا۔ لڑکوں کو تو اس وجہ سے پال لیتے کہ وہ بڑے ہو کر حصول معاش میں ہاتھ بٹائیں گے۔ عام بدامنی میں خاندان کے قوت و بازو بنیں گے۔ جس کے جتنے بیٹے ہوتے وہ اتنا ہی طاقت کا سرچشمہ تصور کیا جاتا۔ جب کہ لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیوں کی حفاظت کرنا پڑتی اور پھر ان کی شادیوں پر اخراجات بھی اٹھتے تھے۔

''عام بدامنی کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا کہ دشمن قبیلے جب ایک دوسرے پر اچانک چھاپے مارتے تھے تو جو لڑکیاں بھی ان کے ہاتھ لگتی تھیں انہیں لے جا کر وہ یا تو لونڈیاں بنا کر رکھتے تھے یا کہیں بیچ ڈالتے تھے۔ ان وجوہ سے عرب میں یہ طریقہ چل پڑا تھا کہ کبھی توزچگی کے وقت ہی عورت کے آگے ایک گڑھا کھود رکھا جاتا تھا تاکہ اگر لڑکی پیدا ہو تو اسی وقت اسے گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دی جائے۔ اور کبھی اگر ماں راضی نہ ہوتی یا اس کے خاندان والے اس میں مانع ہوتے تو باپ بادل ناخواستہ اسے کچھ مدت تک پالتا اور پھر کسی وقت صحرا میں لے جا کر زندہ دفن کر دیتا''۔ (۴۶)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس بارے میں سختی سے حکم دیا ہے۔ آیت کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

''اور تم اپنے بچوں کو مفلسی کے ڈر سے ہلاک نہ کرو ہم تم کو اور ان کو رزق دیتے ہیں''۔ (۴۷)

ایک دوسری جگہ پر ارشاد ہوتا ہے۔ ترجمہ:

''اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے بدلے ہلاک کی گئی''۔ (۴۸)

دیگر تہذیبوں کی طرح عرب میں بچوں کو افلاس کے ڈر سے قتل کیا جاتا تھا لیکن تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ عرب میں اولاد کشی کی سفاکانہ رسم کے جاری ہونے میں بھوک سے زیادہ مذہبی اسباب سرفہرست تھے۔ بہت سے لوگ دیوتاؤں کے حضور منتیں مانتے تھے اور منت کے پورا ہونے کی خوشی میں اپنے بچوں کو دیوتا کے نام پر ذبح کر دیتے تھے۔

''ایک تو مذہبی تھا، یعنی والدین اپنے بچوں کو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے خود ذبح کر کے ان پر چڑھا دیتے تھے، منت مانتے تھے، کہ فلاں کام ہوگا تو اپنے بچہ کی قربانی کریں گے۔ یہ قابلِ نفرت رسم نہ صرف عرب میں بلکہ بہت سی بت پرست قوموں میں جاری تھی۔ رومتہ الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون میں اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کو بالکل اختیار تھا، اس قتل کی کوئی باز پرس نہ تھی اور اولاد کشی کا علانیہ رواج تھا''۔ (۴۹)

ظہورِ اسلام سے قبل یہ قبیح رسمیں پوری آب و تاب سے جاری تھیں۔اس افسوس ناک صورتِ حال کو دیکھ کر تنبیہ کرتے ہوئے ہادی برحق آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا (بھی حرام قرار دیا ہے)''۔(۵۰)

عورتیں جن چیزوں پر آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کیا کرتی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی:

''وہ اپنے بچوں کو ہلاک نہ کیا کریں گی''۔(۵۱)

عرب کی طرح ہندوستان میں بھی دختر کشی اور اولاد کشی کی ظالمانہ رسم زمانہ قدیم سے پائی جاتی تھی۔اس سفاکانہ عمل کا محرک بھی لڑائیاں، پالنے پوسنے کا بوجھ، اور مذہبی پس منظر تھا۔یہ انتہائی قدم بتوں اور دیوتاؤں کی خوشنودی کی خاطر شوق سے اٹھایا جاتا تھا:

''ہندوستان کے راجپوتوں میں یہ دردناک منظر لڑکیوں کی شادی کی شرم و عار سے بچنے اور بیواؤں کی ستی کی صورت میں اور لڑائیوں میں جوہر کی صورت میں رائج تھا، اور سب سے زیادہ یہ کہ بتوں، دیوتاؤں، دیویوں کی خوشی اور نذرانے کے لیے، ان معصوموں کی جانیں بہت آسانی سے لی جاتی تھیں۔''(۵۱)

جب رفتہ رفتہ انسانوں کو انسانی خون کی ارزانی اور ضیاع کا احساس ہوتا گیا تو انہوں نے اپنی زندگیوں کو رواں دواں رکھنے کے لیے اپنے خداؤں کو جانوروں کا لہو چٹانا شروع کر دیا تھا۔بچوں کے بچپن میں بولنے کی روایات موجود ہیں۔ان روایات کا پس منظر مذہبی ہے۔یہ بچے وہ ہیں جنہوں نے مختلف ادوار میں شہادت دی تھی۔کہیں کسی پر لگنے والے بہتان کو غلط ثابت کرنے کے لیے، کہیں پیغمبری کی تصدیق کی خاطر۔چونکہ بچے معصوم ہوتے ہیں، اور کسی کی پاک دامنی اور سچائی کی شہادت کوئی معصوم ہی دے سکتا ہے اور بچے سے بڑھ کر معصوم کون ہوسکتا ہے اور بچہ بھی ایسا جس کی عمر ایک یا کچھ دن کی ہو۔جس نے ابھی بولنا بھی نہ سیکھا ہو۔صرف ایک دن کے بچے نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی دی تھی:

''اہل یمامہ میں سے ایک شخص آپؐ کی خدمت میں ایک بچہ لایا۔جو اسی دن پیدا ہوا تھا۔آپ نے اس سے پوچھا۔اے بچے! میں کون ہوں؟۔وہ بولا۔آپ اللہ کے رسول ہیں۔آپؐ نے فرمایا: تو نے سچ کہا۔اللہ تجھے برکت دے۔پھر اس کے بعد بچے نے کلام نہ کیا۔یہاں تک کہ وہ جوان ہوگیا۔ہم اسے مبارک الیمامہ کہا کرتے تھے''۔(۵۳)

بچوں کے بچپن میں بولنے یعنی شہادت دینے کے بارے میں نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث موجود ہے۔ترجمہ:

''کہ چار شخصوں نے بچپن میں گفتگو کی ہے، فرعون کی بیٹی کی ماشطہ کے بیٹے نے، شاہد یوسف علیہ السلام نے، حضرت جریج کی پاک دامنی کی گواہی دینے والے کم سن بچے نے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے''۔(۵۴)

یہ بچے بالکل نوزائیدہ اور بولنے کے قابل نہیں تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو معجزانہ طور پر قوتِ گویائی دی تھی۔تاکہ وہ ان کے برگزیدہ بندوں کی پاک دامنی کی شہادت دے سکیں۔جب حضرت بی بی مریم علیہ السلام ننھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو

لے کر اپنے عزیزوں میں گئیں تو ان کی گود میں بچہ دیکھ کر وہ تہمت لگانے لگے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف ایک دن کے بچے تھے جب انہوں نے اپنی ماں (مریمؑ) کی پاکی کی گواہی دی۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔ ترجمہ:

''تو مریم نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ (کہ یہ تمہیں حقیقت بتلائے گا) لوگوں نے کہا۔ بھلا ہم اس سے کیسے بات کریں۔ جو ایک بچہ ہے پنگھوڑے میں؟ (تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بول اٹھے جو بچے تھے) فرمایا میں اللہ کا بندہ ہوں''۔ **(۵۵)**

بعض تاریخی کتب میں فرعون کی بیٹی کی ماشطہ کے بیٹے کی بجائے فرعون کی بیوی کی ماشطہ کی بچی کا ذکر آتا ہے ،جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں گواہی دی تھی:

''حضرت مریمؑ پر جب لوگ تہمت باندھنے لگے تو صرف ایک دن کے بچے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے گویائی عطا فرما کر ان کی زبان سے والدہ کی پاکی ظاہر فرمادی، اور قدرتِ خدا وندی کا ایک خاص مظہر سامنے کر دیا۔ بنی اسرائیل کے ایک بزرگ جریج پر اسی طرح کی ایک تہمت ایک بڑی سازش کے ساتھ باندھی گئی تو نوزائیدہ بچے نے ان کی برأت کے لیے شہادت دی ،حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فرعون کو شبہ پیدا ہوا تو فرعون کی بیوی کے بال سنوارنے والی عورت کی چھوٹی بچی کو گویائی عطا ہوئی، اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں فرعون کے ہاتھ سے بچایا۔''**(۵۶)**

حضرت یوسفؑ پر زلیخا نے بہتان باندھا تو ایک چھوٹے بچے نے ان کی برأت کی گواہی دی۔ قرآن پاک میں بچے کا ذکر نہیں، صرف اتنا کہا گیا ہے کہ گواہی دی دینے والے نے۔ البتہ حدیث کی روشنی میں تفاسیر کی کتب میں بچے کے بارے میں تفصیل موجود ہے:

''حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے مطابق ایک چھوٹے بچہ کو حق تعالیٰ نے گویائی عطا فرمادی، اور وہ بھی نہایت عاقلانہ اور حکیمانہ انداز کی۔ یہ چھوٹا بچہ اسی گھر میں گہوارہ کے اندر پڑا تھا یہ کس کو گمان ہو سکتا تھا کہ وہ ان حرکتوں کو دیکھے گا اور سمجھے گا اور پھر اس کو کسی انداز سے بیان کر دے گا''۔ **(۵۷)**

ہم نے تاریخی، تہذیبی ، مذہبی اور اساطیری حوالوں سے دیکھا ہے کہ ہر عہد میں معصوم بچوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا جاتا رہا ہے۔ ابتدائی مشترک سماج میں یہ بچے کہیں گم نامی میں پڑے نظر آتے ہیں تو کہیں دیوتاؤں کی خوشنودی کی خاطر قربان کیے جاتے رہے ہیں۔ کہیں عمارتوں کے استحکام کے لیے بنیادوں میں دفن ہوتے رہے اور کہیں کھیتی باڑی اور طوفانوں کا رخ موڑنے اور بارش برسوانے کا وسیلہ بنتے رہے ہیں۔ بھوک اور افلاس کے ہاتھوں مجبور ماں باپ اپنے بچوں کا قتل بھی کرتے رہے ہیں۔ ستم در ستم تو یہ کہ معصوم بچیوں کو زندہ درگور کرنے کی رسمیں بھی انسانی معاشرے میں پائی جاتی رہی ہیں۔ زندگی کا پہیہ چلتا رہا اور ارتقا کی منزلیں طے کرتا رہا لیکن یہ ظالمانہ سماجی رسمیں برابر ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بظاہر ترقی یافتہ اور روشن خیال معاشروں میں آج بھی یہ قباحتیں موجود ہیں۔ بچوں کو افلاس کے ڈر سے قتل

کیا جاتا ہے، یا دریا میں بہا دیا جاتا ہے۔ جنسی بدفعلی کے بعد معصوم بچوں کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ نومولود بچوں کو اغوا کر کے بیچ دیا جاتا ہے۔ مائیں اپنی جنسی یا ذہنی تسکین کے حصول کی خاطر کم سن بچے چھوڑ کر آشناؤں کے ساتھ چلی جاتی ہیں۔ غرض صورت کوئی بھی ہو، ظلم کا شکار معصوم بچے بنتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد قطب الدین خان دہلوی، نواب، علامہ، مظاہرِ حق جدید، جلد دوم، (کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۵۳

۲۔ امیر الدین، تقی حیدر، تاریخ و تہذیبِ عالم، (لاہور: نگارشات، ۱۹۹۶ء)، ص ۱۴

۳۔ ایضاً، ص ۴۷

۴۔ ابن حنیف، بھولی بسری کھانیاں (یونان)، (ملتان: بیکن بکس، ۱۹۹۶ء)، ص ۵۹۳

۵۔ ایضاً، ص ۵۹۴ ۶۔ ایضاً، ص ۶۲۱

۷۔ ایضاً، ص ۶۲۲

۸۔ نیاز فتح پوری، من و یزداں، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۴ء)، ص ۵۹۳

۹۔ آرزو چوہدری، دیومالائی جہاں (یونانی و رومی دیو مالا)، (لاہور: عظیم اکیڈمی، ۱۹۸۹ء)، ص ۳۳۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۳۷ ۱۱۔ ایضاً، ص ۳۳۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۳۹ ۱۳۔ ایضاً، ص ۳۴۰

۱۴، ۱۵۔ ایضاً، ص ۳۴۶ ۱۶۔ ایضاً، ص ۳۴۷

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۴۵

۱۸، ۱۹۔ سبط حسن، ماضی کے مزار، (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۶ء)، ص ۴۷

۲۰۔ امیر الدین، تقی حیدر، تاریخ و تہذیبِ عالم، ص ۶۶

۲۱۔ باری علیگ، انسانی تمدن کی داستان، (لاہور: تخلیقات، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۱۳

۲۲۔ آرزو چوہدری، دیومالائی جہاں (یونانی و رومی دیو مالا)، ص ۳۴۷

۲۳۔ امیر الدین، تقی حیدر، تاریخ و تہذیبِ عالم، ص ۱۰۲

۲۴۔ باری علیگ، انسانی تمدن کی داستان، ص ۲۹

۲۵۔ القرآن الکریم، سورۃ طٰہٰ، آیت ۴۰

۲۶۔ باری علیگ، انسانی تمدن کی داستان، ص ۹۷

۲۷۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۶ء)، ص ۲۷۰

۲۸۔ افلاطون، ریاست، (دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۱۹۶۶ء)، ترجمہ: ذاکر حسین، ص ۱۹۷
۲۹۔ ایضاً، ص ۱۹۳
۳۰۔ قیصر السلام، قاضی، تاریخِ فلسفہء مغرب، جلد اول، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۲ء)، ص ۱۱۶
۳۱۔ افلاطون، ریاست، ص ۱۹۶ ۳۲۔ ایضاً، ص ۲۰۸
۳۳۔ طارق محمود مغل، معاشرتی نفسیات، (لاہور: غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۷ء)، ص ۱۷۰
۳۴۔ گلزار احمد صوفی، ابتدائی نفسیات (ایف اے)، (لاہور: نذر سنز، ۱۹۸۸ء)، ص ۲۷
۳۵۔ سخی حسن نقوی، سید (مترجم)، تاریخِ قدیم ہندوستان، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۲۸
۳۶۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، مکتبہ دانیال، کراچی ۱۹۹۶ء ص ۱۱۵۔۱۱۶
۳۷۔ باری علیگ، انسانی تمدن کی داستان، ص ۱۳۷
۳۸۔ قیصر السلام، قاضی، تاریخِ فلسفہء مغرب، جلد اول، ص ۱۱۴
۳۹۔ ایضاً، ص ۱۱۶ ۴۰۔ ایضاً، ص ۱۴۸
۴۱۔ باری علیگ، انسانی تمدن کی داستان، ص ۱۲۶
۴۲۔ سخی حسن نقوی، سید (مترجم)، تاریخِ قدیم ہندوستان، ص ۴۷
۴۳۔ ادریس کاندھلوی، مولانا، سیرت المصطفیٰ ؐ، جلد سوئم، (دہلی: فرید بک ڈپو، ۲۰۰۱ء)، ص ۱۹۸
۴۴۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، ص ۱۳۰
۴۵۔ القرآن الکریم، سورۃ کہف، آیت ۴۷
۴۶۔ ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القران، جلد ششم، (لاہور: ترجمان القران، ۱۹۷۲ء)، ص ۲۶۵
۴۷۔ القرآن الکریم، سورۃ انعام، آیت ۱۹
۴۸۔ القرآن الکریم، سورۃ التکویر، آیت ۸
۴۹۔ سلمان ندوی، سیرۃ النبی ؐ، جلد ششم، (اعظم گڑھ: معارف، ۱۹۶۲ء) ص ۲۳۱
۵۰۔ ظہور الباری اعظمی، تفہیم البخاری (کتاب الادب)، (کراچی: دارالاشاعت، س۔ن)، ص ۳۷۶
۵۱۔ القرآن الکریم، سورۃ الممتحنہ، آیت ۱۲
۵۲۔ سلمان ندوی، سیرۃ النبی ؐ، جلد ششم، ص ۲۳۱
۵۳۔ نور بخش توکلی، سیرتِ رسولِ ؐ عربی، (لاہور: علی کامران پبلشر، ۱۹۸۴ء)، ص ۲۲۳
۵۴۔ محمد عبدالرشید قاسمی، قصص الانبیاؑ، (لاہور: کتب خانہ شان اسلام، ۲۰۰۵ء)، ص ۲۰۰
۵۵۔ القرآن الکریم، سورۃ مریم، آیت نمبر ۲۹
۵۶، ۵۷۔ محمد شفیع، مفتی، معارف القران، جلد پنجم، (کراچی: ادارۃ المعارف، ۱۹۸۷ء)، ص ۴۳